اُردو ادب اور ہندوستانی فلم

ڈاکٹر عرفان عارف

مشہور فکشن نگار مشرف عالمی ذوقی نے لکھا ہے کہ

''زندہ زبانیں زندگی کے ہر شعبے سے وابستہ ہوتی ہیں اور ان کے اثرات اتنے گہرے ہوتے ہیں کہ ہر شعبے کو ان کی ضرورت ہوتی ہے۔ المیہ یہ ہے کہ جیسے جیسے وقت گزر رہا ہے، اردو ہماری ضرورت کی حدوں سے دور ہوتی جارہی ہے۔ اردو بولنے والے معاشرے کے سامنے اب تشخص کے ساتھ، زبان کے تحفظ کا مسئلہ بھی درپیش ہے۔ اور اسی لیے یہ سوال بار بار سامنے آتا ہے کہ اردو کو زندہ رکھنے نیز فروغ دینے کے لیے کس طرح کی تدبیریں کی جاسکتی ہیں۔ اور یہیں پر دھند بھرے موسم میں ایک سوال ہمارا راستہ روک کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ کہ کیا اردو کے فروغ کے لیے فلم اور میڈیا ہمارے کسی کام آ سکتا ہے؟'' (''اکیسویں صدی میں اردو: فروغ اور امکانات، مشمولہ مضمون ''اردو کے فروغ میں میڈیا اور فلم کا کردار'' مشرف عالم ذوقی

،این سی پی یو ایل 2014 ص ۲۰۷)

سوال کام آسکنے کا نہیں ہے بلکہ یہ ایک سچائی ہے کہ اردو کے فروغ میں ہندوستانی فلموں نے ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ آزادی سے پہلے بھی جو پہلی بولتی فلم ''عالم آرا'' بنی، اس میں مکالموں اور گیتوں کی زبان اردو ہی تھی۔ اس سے بھی پیچھے چلے جائیں جب بے زبان فلمیں بنتی تھی ان میں بھی جہاں گیتوں کی گنجائش ہوتی تھی وہاں بھی پردے کے پیچھے نغمہ نگار اور ساز ندے بیٹھے ہوتے تھے اور گیت یا گانا شروع ہوتے ہی مغنی یا گائک گیت یا غزل شروع کرتا تھا اور ساز ندے اس کا ساتھ دیتے تھے۔ ان گیتوں اور غزلوں کی زبان بھی اردو ہی ہوتی تھی۔

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ خاموش اور بولتی فلموں میں مکالمے بھی اردو میں ہی ہوتے تھے۔ چنانچہ آزادی کے بعد جب فلم انڈسٹری ترقی کی کئی منزلیں طے کر چکی تو فلموں کی کہانی، اسکرین پلے، مکالمے اور گیت یا غزلیں وغیرہ لکھنے کے لیے اردو کے کہانی کاروں، ادیبوں اور شاعروں کو بلایا گیا۔ ان میں پریم چند، شاہد لطیف، ساگر سرحدی، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، علیم مسرور، کیفی اعظمی، خواجہ احمد عباس، شکیل بدایونی، مجروح سلطان پوری، ساحر لدھیانوی، راجندر کرشن، رامانند ساگر، اُپندر ناتھ اشک، کیف بھوپالی، اختر الایمان، جاں نثار اختر، کیفی اعظمی اور علی سردار جعفری وغیرہ کے نام کافی اہم ہیں۔ ان ادیبوں اور شاعروں نے فلموں کے جس مزاج کی تشکیل کی وہ اردو کا مزاج تھا اسی لیے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ آزادی سے لے کر چھٹی ساتویں دہائی تک جو فلمیں سامنے آئیں ان کے مکالموں کی زبان اور بیان میں شرفا کی تہذیب و تمدن کا خیال رکھا جاتا تھا۔ خاص طور پر دلیپ کمار، راج کپور اور اشوک کمار کی فلموں میں نہ صرف الفاظ کی نشست و

برخاست بلکہ لب ولہجہ تک میں تہذیب اور تمیز کو برتا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس دور کے موسیقی کار مثلاً نوشاد اور خیام وغیرہ جو گیت اور غزلیں لکھواتے تھے ان کا ایک ادبی معیار ہوتا تھا ان گیتوں اور غزلوں میں موسیقیت کے ساتھ ساتھ شعریت بھی ہوا کرتی تھی۔ مثال کے طور پر دلیپ کمار کی فلم ''آن''، اشوک کمار کی فلم ''محل''، راج کپور کی فلم ''شری چار سو بیس'' وغیرہ کے گانے یاد کیے جا سکتے ہیں۔ ہندوستانی فلموں کے گلوکار پلے بیک سنگر (Play back singer) کے بغیر بھی فلم کا مکمل ہونا نا ممکن ہوتا ہے۔ ہندوستانی فلموں میں جن مشہور و مقبول گلوگاروں نے اپنی سریلی آوازوں سے تحریروں کو چار چاند لگائے ان میں کشور کمار، محمد رفیع، لتا منگیشکر، نور جہاں، مبارک بیگم، آشا بھونسلے، سلمیٰ آغا، شمشاد بیگم، مکیش، جگجیت سنگھ، الکا یاگنک، انورادھا پوڈوال، سونو نگم، کمار سانو، نصرت فتح علی خان، محمد عزیز، راحت فتح علی خان، اُدت نارائن، پنکج اداس، طلعت محمود، شان، عدنان سمیع، بھوپندر سنگھ، چترا سنگھ، مہندر کپور، اے آر رحمان، ابھی جیت ساونت وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

فلمی نغموں میں غنائت اور تغزل کی کیفیات بھی نظر آتی ہیں خاص طور پر شکیل بدایونی اور حسرت جے پوری، راجہ مہدی علی خاں اور ساحر لدھیانوی وغیرہ کے گیتوں گانوں میں معنویت بھی ہوتی تھی، مقصدیت تھی اور شعریت بھی۔ اس سلسلے میں ساحر لدھیانوی کے مجموعہ ''پرچھائیاں'' میں ان کے فلمی گیت اور غزلوں کی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ امیتابھ بچن کی فلم ''کبھی کبھی'' جو 1976 میں ریلیز ہوئی، میں ساحر کے لکھے ہوئے گیت کے ایسے بول

کبھی کبھی مرے دل میں خیال آتا ہے
کہ زندگی تری زلفو ں کی نرم چھاؤں میں

گرزنے پاتی تو شاداب ہو بھی سکتی تھی

اسی طرح لیلیٰ مجنوں کے ایک نغمے کا یہ شعر کسی عمدہ غزل کا مطلع معلوم ہوتا ہے۔

بہت رنجور ہے یہ، غموں سے چور ہے یہ
خدا کا خوف کھاؤ ، بہت مجبور ہے یہ

مشہور ہندوستانی فلم ''وقت'' کی وہ قوالی آج بھی شوق سے سنی جاتی ہے اور اس شعر کی حیثیت ایک ضرب المثل کی ہوگئی ہے۔

اے میری زہرہ جبیں تجھے معلوم نہیں
تو ابھی تک ہے حسیں اور میں جواں

ساحر لدھیانوی کی اس قوالی میں فلم پروڈیوسر زبلدیوراج چوپڑا نے لفظ ''زہرہ جبیں'' کو تبدیل کرنے کا مشورہ دیا، ساحر نے کہا کہ ''معیار کے ساتھ سمجھوتا نہیں۔ جو میرا معیار ہے میں وہی لکھوں گا''۔

یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ فلم انڈسٹری سے جتنے بھی اردو کے ادیب اور شاعر وابستہ رہے ان میں زیادہ تر ترقی پسند تھے۔ اسی لیے ہندوستانی فلموں میں قومی یکجہتی کو فروغ دینے کی شعوری کوشش ملتی ہے۔ منٹو، شاہد لطیف، خواجہ احمد عباس اور بیدی نے جتنی بھی فلمیں لکھی ان میں ہندو مسلم اتحاد پر زیادہ زور دیا گیا۔ اس سلسلے میں ''گرم ہوا'' اور ''دھرم پتر'' سے لیکر ''امراکبر اینتھونی'' تک کی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ ''دھرم پتر'' میں ساحر نے ہندو مسلم اتحاد کو ذہن میں رکھتے ہوئے ایک قوالی لکھی جس کے بول یہ تھے۔

یہ مسجد ہے وہ بت خانہ چاہے یہ مانو چاہے وہ مانو
مقصد تو ہے دل کو سمجھانا چاہے یہ مانو چاہے وہ مانو

ساحر لدھیانوی نے اپنے گیتوں غزلوں میں ذو معنی الفاظ، رومانیت اور تغزل کو بھی بڑی خوبصورتی سے برتا ہے۔ مثلاً فلم ''تاج محل'' کے ایک گانے کا یہ شعر۔

چاندی کا بدن سونے کی نظر اس پر یہ نزاکت کیا کہیے

اردو زبان کے فروغ میں ہندوستانی فلموں کے کردار کے حوالے سے یہ بھی ایک اہم نکتہ ہے کہ فلموں میں اس زمانے کے شاعرانہ ذوق کو ذہن میں رکھتے ہوئے امیر خسرو، میر، غالب، مومن، داغ، حسرت، اکبر آبادی، اقبال، فیض، شہر یار، ندا فاضلی، بشیر بدر وغیرہ کی غزلیں بھی کسی نہ کسی شکل میں پیش کی گئیں۔ مثال کے طور پر 1936ء میں ریلیز ہوئی محبوب خان کی فلم ''دکن کوین'' میں گلوکار سریندر نے غالب کی یہ مشہور غزل گائی تھی۔

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

اسی طرح 1949ء میں فلم ''نیکی اور بدی'' میں مومن کی غزل موقع و محل کے اعتبار سے بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کی گئی۔

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

1940ء میں ایس ایف حسین کی ہدایت پر بننے والی فلم ''قیدی'' کی کہانی غالباً قادر خان نے لکھی تھی۔ اور اس میں غالب کی دو غزلیں فلمائی گئی تھیں۔ ایک غزل جس کا مطلع ہے

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

اسی طرح غالب کی دوسری غزل دیکھیں:

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

کو بھی بڑی خوبی سے پیش کیا گیا ہے۔

غالب کی شاعری مشکل فہم ہے لیکن اس کے باوجود ہندوستانی فلموں میں غالب کی شاعری کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ مرزا غالب کی حیات پر ایک فلم بھی ''مرزا غالب'' کے نام سے بنائی گئی۔ اس فلم میں اس زمانے کے مشہور و معروف گلوکاروں طلعت محمود اور ثریا نے غالب کی غزلیں اس انداز سے گائیں کہ اردو والوں کے ساتھ ساتھ غیر اردو داں طبقہ بھی غالب کی غزلیں گنگناتا رہتا ہے۔ مثلاً یہ غزل جس کا مطلع

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

یا پھر ثریا کی آواز میں غالب کی یہ غزل

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

آج بھی جب کوئی سنتا ہے تو اس کا دل بھر آتا ہے۔ چند سال قبل مظفر علی کی فلم ''امراؤ جان ادا'' بنی تو اس میں میرؔ کی یہ غزل

دل چیز کیا ہے آپ میری جان لیجیے
بس ایک بار میرا کہا مان لیجیے

پیش کی گئی اور فلم اسٹار ریکھا کی اداؤں کے سبب میرؔ کی اس غزل کی

معنویت کی کئی تہیں کھل کر سامنے آتی ہیں۔

اس طرح کی اور بھی درجنوں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں جن میں ارادی طور پر اردو کو فروغ دینے کی کوشش کی گئی ہے۔مثلاً:

رفتہ رفتہ وہ میری ہستی کا ساماں ہو گئے

(تسلیم فاضلی ،مہدی حسن،فلم: زینت)

ہوش والوں کو خبر کیا بے خودی کیا چیز ہے

(ندا فاضلی ،جگجیت سنگھ،فلم: سرفروش)

گلوں میں رنگ بھرے باگ نو بہار چلے

(فیض احمد فیض ،مہدی حسن ،ارجیت سنگھ،فلم: حیدر)

دکھائی دیے یوں کہ بے خود کیا

(میر تقی میر،لتا منگیشکر،فلم: بازار)

ہستی اپنی حباب کی سی ہے

(میر تقی میر، ہری ہرن)

پیا باج پیالہ پیا جائے نا

(قلی قطب شاہ، پکھراج)

سایہ بھی ساتھ جب چھوڑ جائے ایسی ہے تنہائی

(جاوید اختر ،نصرت فتح علی خان، دل لگی)

کسی نظر کو تیرا انتظار آج بھی ہے

(حسرت جے پوری، بھوپیندر سنگھ، آشا بھانسلے،فلم: اعتبار)

غم ہے یا خوشی ہے تو، میری زندگی ہے تو

(فلم: کارتوس)

ان کے علاوہ اور بھی غزلیں اور اشعار ہیں جو ہو بہو فلموں میں بطور نغمہ پیش کیے گئے ہیں۔

اردو شاعروں میں کئی ایسے نام ہیں جنہوں نے اپنے اردو کلام سے فلمی نغموں کے معیار کو بلند کیا اور ان میں اردو زبان کے ذریعے اتنی حلاوت اور شیرینی ڈال دی کہ اردو کے مستعمل الفاظ نہ سمجھنے والا بھی اس سے محظوظ ہوتا ہے۔ ہندوستانی فلموں کا یہ شاعرانہ مزاج آج بھی باقی ہے اور آج بھی سنجیدہ فلموں میں جو گیت، نغمے اور مکالمے لکھے جاتے ہیں ان میں زبان کے ساتھ ساتھ مزاج بھی اردو ہی کا ہوتا ہے۔ مثلاً 2003 میں ریلیز ہوئی فلم ''دھوپ'' میں ندا فاضلی نے ایک انقلابی غزل لکھی:

ہر ایک گھر میں دیا بھی جلے اناج بھی ہو　　اگر نہ ہو کہیں ایسا تو احتجاج بھی ہو
حکومتوں کو بدلنا تو کوئی محال نہیں　　حکومتیں جو بدلتا ہے وہ سماج بھی ہو

یا فلم ''آہستہ آہستہ'' میں ندا فاضلی کے بول ملاحظہ ہوں

کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا
کہیں زمیں تو کہیں آسماں نہیں ملتا

فلم ''گمان'' میں شہریار کا لکھا یہ شعر ملاحظہ ہو

سینے میں جلن آنکھوں میں طوفان سا کیوں ہے
اس شہر میں ہر شخص پریشان سا کیوں ہے

اسی طرح مشہور زمانہ شاعر اکبر الہ آبادی کی غزل

''ہنگامہ ہے کیوں برپا تھوڑی سی جو پی لی ہے

ڈاکہ تو نہیں ڈالا چوری تو نہیں کی ہے

فلم ''نمک حلال'' میں امیتابھ بچن پر فلمائی گئی ہے۔حد تو یہ ہے کہ اقبالؔ جیسے فلسفی شاعر کی شاعری کو بھی فلموں میں موقع ومحل کے اعتبار سے پیش کیا گیا ہے۔فلم ''داستان'' میں علامہ اقبال کے مصرعہ ''نہ تو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے'' کو بنیاد بنا کر ساحر لدھیانوی نے ایک پورا گیت لکھ دیا ہے۔ایک فلم ''رومیو اور جولیٹ'' میں فیض احمد فیضؔ کی غزل

دونوں جہاں تیری محبت میں ہار کے
وہ جا رہا ہے کوئی شبِ غم گزار کے

1947ء کے آس پاس اس زمانے کی گلوکارہ زہرہ بائی امبالے والی نے گائی تھی۔اسی طرح فلم ''جانور'' میں فیض کی یہ غزل آشا بھونسلے کی آواز فلمائی گئی ہے۔

رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے
جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آجائے

یہاں یہ بات بھی بڑی دلچسپ ہے کہ ہندوستانی فلموں میں اردو نظمیں بھی بڑی فن کاری کے ساتھ پیش کی گئی۔مثلاً فلم ''چچا'' میں مخدوم محی الدین کی نظم

''اک چنبیلی کے منڈوے تلے
مے کدے سے ذرا دور اس موڑ پر
دو بدن
پیار کی آگ میں جل گئے''

مجاز لکھنوی کی ایک نظم ''مجبوریاں'' ہے۔اس کا ایک شعر

آہیں بھر نہیں سکتا کہ نغمے گا نہیں سکتا
سکوں لیکن مرے دل کو میسر آ نہیں سکتا

اس طرح پیش کی گئی کہ آج بھی لوگ اسے بھولے نہیں۔اسی طرح فلم ''گمان'' میں اور فلم ''بازار'' میں بھی مخدوم محی الدین کی غزلیں طلعت عزیز کی آواز میں فلمائی گئی۔

پھر چھڑی بات رات پھولوں کی
رات ہے یا برات پھولوں کی

فیض احمد فیض کی مشہورِ زمانہ نظم ''مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ''، فلم ''قیدی'' میں میٹھی اور سریلی آواز میں نور جہاں نے گائی ہے۔

ہندوستانی فلموں میں گرودت کی فلم ''پیاسا'' ایک شاہکار مانی جاتی ہے۔اس فلم کی کہانی بڑی حد تک ساحر کی داستانِ حیات سے مشابہت رکھتی ہے۔اس فلم میں مجاز لکھنوی کی غزل گرودت پر فلمائی گئی اس کے موسیقی کار سچن برمن تھے۔اس غزل کا شعر یوں ہے۔

رودادِ غمِ الفت ان سے ہم کیا کہتے کیوں کر کہتے
ایک حرف نہ نکلا ہونٹوں سے اور آنکھ میں آنسو آ بھی گئے

ایک فلم ''لال قلعہ'' میں محمد رفیع نے بہادر شاہ ظفر کی غزل

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
کسی کام میں جو نہ آ سکے میں وہ ایک مشتِ غبار ہوں

گائی ہے۔ ہندوستانی فلموں میں مشہور شاعروں کے اشعار، گانوں اور گیتوں میں استعمال کرنے کی روایت آج بھی برقرار ہے۔

ہندوستانی فلموں کی تاریخ کا اگر جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ 1885 میں مشہور سائنسدان مائی برج کے پروجیکٹر کی ایجاد نے اس فن کے لیے راہیں ہموار کیں۔ 28 دسمبر 1895ء کو ''گرانڈ کیفے پیرس'' کی نچلی منزل میں Projector کی وساطت سے لومیری برادران نے اپنی فوٹو گرافی کا تجربہ کیا۔اس تجربے سے فلم کا آغاز ہوا۔انہوں نے ساکن تصویر کو متحرک کر دکھایا جس کے بعد دنیائے فلم کی کایا ہی پلٹ گئی ۔ پروجیکٹر کی مدد سے فلم کو پردے پر حرکت کرتے دکھایا گیا تھا۔لیکن ہندوستان میں سنیما فوٹو گراف کی پہلی نمائش 7 جولائی 1896ء کو فرانس کے لومیری برادران نے ممبئی کے واٹسن ہوٹل میں کی تھی۔

18 مئی 1912 کو ممبئی میں بھارت کی پہلی خاموش تھیٹریکل فلم ''پنڈلک'' کی نمائش ہوئی جو بارہ منٹ کی طوالت پر مشتمل تھی۔ یہ ہالی ووڈ کی ایک فلم ''اے ڈیڈ مینز چایلڈ A Dead Man's Child کے شو کے حصے کے طور پر دکھائی گئی تھی ورنہ یہ ہندوستان کی پہلی خاموش فلم مانی جاتی۔بہرحال بابائے فلم دادا صاحب پھالکے کو فلم بنانے کا بہت شوق تھا لہٰذا 1912ء میں دادا صاحب نے ایک فلمی کیمرہ خریدا۔فلم بنانے کے لیے فائنانسروں سے رابطہ قائم کیا، اور ہندوستان میں پہلی 40 منٹ کی خاموش مکمل فیچر فلم ''راجہ ہریش چندر'' بنائی جسے 21 اپریل 1913 کو مخصوص طبقے اور 3 مئی 1913ء کو عوام کے لیے ریلیز کیا گیا۔اس فلم کے ہدایت کار، پروڈیوسر اور منظر نویس دادا صاحب پھالکے تھے جبکہ مرکزی کردار کے لئے دتا رائے دبکے اور انا سالنکے کی خدمات حاصل کیں۔یہی فلم انڈین فلم انڈسٹری یعنی بالی ووڈ کی بنیاد بنی ہے۔اب دادا صاحب پھالکے خاموش فلموں کے کرداروں کو آواز دینے کے لیے تجربے اور مشاہدے کرنے لگے تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا آخر کار

ان کے حسین خواب کی تکمیل آردیشر ایرانی(Ardeshir Irani) کے ہاتھوں ہوئی جب انہوں نے ہندوستان کی پہلی متکلم فلم ''عالم آرا'' کے نام سے 14 مارچ 1931 کو ممبئی کے میجسٹک تھیٹر میں پیش کی۔اس فلم کا دورانیہ 124 منٹ یعنی دو گھنٹے اور چار منٹ تھا جبکہ مرکزی کردار کے لئے ماسٹر وٹھل اور رانی زبیدہ کی خدمات حاصل کیں۔پھر ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے فلم سازوں نے متکلم فلموں کی زیادہ سے زیادہ نمائش کرنا شروع کر دیا۔ 1931 کی بولتی فلم سے گفتگو کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ آج بھی جاری ہے۔اور اردو کی شیرینی اور جادو بیانی اسے آئندہ بھی سالوں سال زندہ رکھے گی۔

آج کی نئی فلموں مثلاً امیتابھ بچن کی '' جھنڈ ''سلمان خان کی فلم ''کک''، عامر خان کی فلم ''لال سنگھ چڈا'' اور شاہ رخ خان کی فلم ''چنئی ایکسپرس''، اکشے کمار کی ''بچن پانڈے'' ریتک روشن کی فلم '' قابل'' وغیرہ کے مکالموں، گانوں اور گیتوں کی زبان میں پہلی جیسی بات نہیں رہ گئی ہے۔عوامی سطح پر ہندی الفاظ اور محاورات کے چلن کی وجہ سے فلموں میں بھی عوام کے ذوق اور مزاج کے مطابق زبان استعمال نہیں کی جا رہی ہے لیکن اس کے باوجود فلموں کے مکالموں اور نغموں وغیرہ میں اردو کا غلبہ نظر آتا ہے۔ٹھیٹھ بازاری زبان، ذو معنی جملے مکالمے بعض فلموں میں ضرور لائے گئے لیکن سنجیدہ سامعین اسے قبول نہیں کرتے اور ایسی دوسرے تیسرے درجے کی فلمیں عوام میں مقبولیت حاصل نہیں کر سکتی۔

عوام آج بھی ''مغل اعظم''، ''تاج محل''اور'' برسات کی رات'' جیسی فلموں کے خالص اردو مزاج کو فراموش نہیں کر سکتے ہیں ایسی فلموں کی کامیابی میں اردو کا اہم کردار رہا ہے۔لہٰذا فلموں کے معیار کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ

ایک بار پھر اردو زبان اور شاعری سے استفادہ کیا جائے۔

آج کی فلموں میں جہاں ایک طرف جدید ٹیکنالوجی کی مدد سے fantasy فنٹاسی پیدا کی جاتی ہے تو دوسری جانب جنس اور Sex، ماردھاڑ، ہنسی مذاق کے واقعات بھی کثرت سے پیش کیے جارہے ہیں۔فلموں کی کہانیاں بھی عوامی بازاری مزاج کے مطابق لکھی جارہی ہیں۔آج زبان سے زیادہ ایکشن اور ٹیکنالوجی پر توجہ دی جاتی ہے۔

پہلے محبت اور اتحاد پر فلمیں بنتی تھیں اور آج کی فلموں میں نفرت اور ٹکراؤ ہی زیادہ دکھایا جاتا ہے۔آج حقیقت سے زیادہ خیالی اور تصوراتی واقعات اور کردار پیش کیے جاتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ آج کل فلموں میں سائی فائی (سائنس اور فکشن) سے متعلق بہت زیادہ دکھایا جارہا ہے۔ایسی فلموں میں روبوٹ، کوئی مل گیا، ڈاکٹر، کرلیش، منل مرلی، پی۔کے، بھرم استر، راون، باہوبلی، مشن منگل۔مکھی، پہیلی، الہ دین، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔اس کے باوجود تاریخی کرداروں اور حب الوطنی پر بھی بے شمار فلمیں بنتی ہیں جن میں 83، باجی راؤ مستانی، اشوک دی گریٹ، سوراج، جودھا اکبر وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

ہمارے ملک میں آج کوئی بھی کسی بھی میدان میں کوئی کارنامہ کوئی انجام دیتا ہے تو اس کے فن اور خدمات پر کثرت سے بایوفلمیں بنائی جارہی ہیں۔مثلاً پرینکا چوپڑا نے بوکسر میری کام پر فلم ''میری کام'' بنائی، مشہور کرکٹر مہندر سنگھ دھونی پر سوسانت سنگھ راجپوت نے ''ایم۔ایس دھونی'' بنائی، عامر خان کی ''دنگل''، فرحان اختر کی ''باگ ملکا باگ'' عرفان خان کی ''پان سنگھ تومر''، رتک روشن کی ''سپر 30''، آر مادھون کی ''راکٹ ری''، نواز الدین صدیقی کی ''ٹھاکرے'' اور ''

منٹو''، ابھی شیخ بچن کی ''بگ بُل''، ودیا بالن کی ''شکنتلا'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

وقت اور حالات کے پیش نظر بدلتی ہوئی اخلاقی، سیاسی اور سماجی اقدار کے زیر اثر بالی ووڈ فلمیں بھی بدلتی جا رہی ہیں ۔ جدید دور کی فلمی زبان کو آپ ہندی، ہندوستانی جو چاہیں کہیں، لیکن اس میں اردو کے جو رنگ شامل ہیں اس کی اہمیت وافادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اردو نے سب پہلے ہندی کے الفاظ میں گھل مل کر اپنا ایک کلچر قائم کرلیا۔ پھر انگریزی، فیشن زدہ سیلاب کی طرح ہندوستانی فلموں میں داخل ہوئی تو اردو نے اس کے ساتھ بھی حیرت انگیز طور پر نباہ کی۔ اس مقام پر ذہن میں چند سوالات بھی ابھرتے ہوں گے۔؟

کیا فلم، ادب کی کوکھ سے جنم لینے والی ایک صنعتی صنف ہے۔ فلم انڈسٹری، جسے موشن پکچر انڈسٹری کہا جاتا ہے، یعنی فلم بذات خود ایک ترکیبی عمل سے وجود میں آتی ہے۔ چنانچہ اسے تخلیقی چیز کہا جاسکتا ہے یا نہیں۔ کیونکہ ایک چیز جس کی تکمیل میں ہدایت کار، نغمہ نگار، مکالمہ نگار اور بہت سے فنکاروں اور محنت کشوں کے ذہنی اشتراک، تکنیکی مہارت اور جسمانی مشقت کا عمل دخل ہو، کیا وہ واقعی تخلیقی زمرے میں آسکتی ہے؟

کیا ایک معیاری فلم کا تصور ایک کہانی، افسانے یا ڈرامے کی تخلیق سے قبل ممکن ہے۔ جبکہ ابتدا سے لے کر عہد حاضر تک اردو ادب کے مشہور افسانے، کہانیاں اور ڈرامے فلموں میں ڈھلتے رہے ہیں۔

فلم اور ادب کے باہمی رشتوں کا تناظر نہایت وسیع ہے۔ فلم سے اردو ہی نہیں بلکہ ہندی، بنگالی، تامل، ملیالم اور پنجابی وغیرہ کے ادب سے ایک رشتہ ہے۔ لیکن فلم کی تعمیر وترقی میں سب سے زیادہ اہم کردار نبھانے والا ''اردو ادب'' ہی ہے۔

کیونکہ اردو ہندوستان کے عوام کی زبان ہے۔محبت، بھائی چارے اور امن کی زبان ہے۔

دراصل ہندوستانی فلم کی اساس ہی اردو پر رکھی گئی۔جس کی بہترین مثال پہلی (متکلم) ٹاکی فلم ''عالم آرا'' کے مکالمے منشی ظہیر نے اردو میں لکھے تھے۔ابتداء میں فلمی دنیا میں شاعروں کی خاصی کمی رہی۔کوئی بڑی کمپنی ہی کسی شاعر کو لایا کرتی تھی۔یوں تو تنویر نقوی، کیدار شرما، آرزو لکھنوی اور دیوان شرما وغیرہ بھی فلموں سے وابستہ ہو گئے تھے لیکن انتہا یہ کہ آرزو لکھنوی جیسے مستند شاعر کو بھی 1936ء میں اداکاروں کا ''ش ق'' درست کرانے کے واسطے بلایا گیا تھا۔پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہر بڑا ادیب و شاعر فلم کی طرف دوڑنے لگا۔بے شمار نغمہ نگاروں اور کہانی کاروں، نیز منظر نامے لکھنے والے ادیبوں و شاعروں میں سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، رامانند ساگر، خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی، ساحر لدھیانوی، شکیل بدایونی، مجروح سلطان پوری، راجندر کرشن، جانثار اختر، کیفی اعظمی اور علی سردار جعفری جیسے افراد فلمی افق پر چھا گئے۔ان تمام مستند شعراء و ادباء نے عوام کے عقل و فہم اور ان کے ذوق کو سامنے رکھتے ہوئے فلمی کہانیاں لکھیں۔اس کو مجبوری کہہ لیجیے یا ضرورت کہ فلمی دنیا سے وابستہ ہر ادیب و شاعر عوام کے ذہن سے سمجھوتا کرنے پر مجبور ہے۔جو ایسا نہیں کر پاتے انہیں اس نگری سے ہجرت کرنا پڑتی ہے۔ٹالسٹائی نے بہت پہلے ایسے فلمی سمجھوتے کا خطرہ محسوس کرتے ہوئے کہا تھا۔

> ''وہ دن دور نہیں جب ہینڈل سے گھومنے والی ایک مشین (کیمرہ) ہم ادیبوں کی زندگی چکر میں ڈال دے گی اور دنیا میں لکھنے لکھانے کا نیا سلسلہ شروع ہوگا''۔

ادب اور فلم کا عوام پسند ہونا ضروری ہے چوں کہ عوامی مقبولیت کے بغیر فلم کی کامیابی ممکن نہیں ہے۔ دل چھوتی کہانیاں، حقیقت سے میل کھاتے منظر نامے، جذبات کی صحیح عکاسی کرتے مکالمے، روح پرور اور نشاط انگیز نغمات نے عوام کے دلوں میں فلم اور اردو کی محبت کو خوب پروان چڑھایا۔ فلموں کے نام سے لے کر مکالموں، کہانیوں اور گیتوں تک میں اردو کی ہی حکمرانی نظر آتی ہے، لیکن اردو کے ساتھ یہ امتیاز مستقل برتا جاتا ہے کہ خالص اردو فلموں کو بھی ''ہندی سرٹیفکٹ'' دیا جاتا ہے۔ ایسے میں مظفر علی یا ناصر حسین جیسے لوگ چند ہی ہیں جو اپنی فلم کا سرٹیفکٹ ''اردو'' میں لیتے ہیں۔ کچھ فنکاروں نے گائیکی کو اپنی کلید بنایا اور فن (غزل یا نظم) کی دُنیا میں شہرت جاوداں حاصل ہے۔ مہدی حسن خان، غلام علی، اقبال بانو، اور فریدہ خانم، نصرت فتح علی خاں، پنکج اداس، جگجیت سنگھ، چترا سنگھ وغیرہ نے غزلیں گا گا کر عوام تک اردو کو پہنچایا۔

اردو ادب اور فلم میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ دیکھیں ''روزنامہ جنگ، کراچی'' کی 5 ستمبر 1948ء کی اشاعت میں صفحہ اوّل پر اخبار کے زیریں حصّے میں ایک فلم کا اشتہار کچھ یوں شایع ہوا، ''جگر، ساغر، جوشؔ کا کلام پردہ سیمیں پر سُنیے اور اس کے ساتھ فضلی برادرز کی مسلم سوشل فلم، ''چورنگی'' دیکھیے۔ روزنامہ ''جنگ'' ہی میں 16 دسمبر 1963 کے فلمی ایڈیشن میں پاکستانی فلم ''اِک تیرا سہارا'' کا اشتہار شایع ہوا۔ فلم کے ہیرو، ہیروئن اُس زمانے کے معروف اداکار اور اداکارہ درپن اور شمیم آرا تھے۔ تاہم، انتہائی دل چسپ بات یہ ہے کہ فلمی ستاروں کے نام تو باریک حروف میں شایع ہوئے، مگر انتہائی جَلی حروف میں ''گانے: قتیل شفائی اور حمایت علی شاعر'' درج کیا گیا تھا۔

اگر چہ ہندوستانی فلم کی ابتداء دھارمک پرانک کتھا کہانیوں سے ہوئی۔ پھر دیش بھگتی کے رنگ میں دلیپ کمار کی ایک ابتدائی فلم شہید'' (1948) انگریزوں کے خلاف ہندوستان کے باغی نوجوانوں کی جدوجہد کا بیانیہ تھا جبکہ منوج کمار کی ''شہید'' 1965 میں معروف باغی بھگت سنگھ کی زندگی کو فلمایا گیا تھا۔ کلر پروڈکشن ''جھانسی کی رانی'' سے لیکر کنگنا رناوت کی ''منی کرنیکا: ''دی کوئین آف جھانسی'' تک، آزادی کے موضوع پر بالی وڈ نے تسلسل کے ساتھ کام کیا ہے۔ زندگی سے بھر پور اور جدو جہد کے شوق سے معمور فلمیں ناظریں کو دی ہیں۔ عامر خان کی ''منگل پانڈے،، ''رنگ دے بسنتی'' اور ''لگان'' میں انگریزوں کے خلاف مروجہ بیانیہ میں ایک انقلابی تبدیلی تھی۔

مختلف امراض پر مبنی فلمیں بھی کافی مقبول ہوئی ہیں جن میں '' آہ'' (۱۹۵۳ء) ،''بندنی'' (۱۹۶۳)،'' کھلونا'' (۱۹۷۰ء)،'' گھر'' (۱۹۷۸ء)، ''مدہوش''(۲۰۰۴)، ''صاحب بیوی اور غلام'' (۱۹۶۳)،'' ڈر''(۱۹۹۳ء) ، ''مرڈر۲''(۲۰۱۱)،'' کوئی مل گیا''، '' تیرے نام''، ''بلیک'' (۲۰۰۵) ،''گجنی'' (۲۰۰۸) ،''جب تک ہے جان''، '' تارے زمین پر'' (۲۰۰۷)،''مائی نیم از خان'' (۲۰۱۰)،''برفی''(۲۰۱۲)،''پا''(۲۰۰۹) وغیرہ شامل ہیں۔

ماحولیات ،عوامی صحت وصفائی جیسے بظاہر خشک اور غیر دلچسپ موضوع پر بننے والی فلم ''ٹائلٹ ایک پریم کتھا'' کی کامیابی نے ناقدینِ فلم کو حیرت میں ڈال رکھا ہے اور پہلوان عورتوں کی کہانی ''دنگل'' عام روش سے ہٹ کر اور فلم صنعت کو طلسماتی مظاہرے سے نکال کر ان فلموں میں سماجی ،تہذیبی ، اخلاقی اقدار کا از سرِ نو جوڑنے کا جذبہ بھی کارفرما تھا۔ اردو ادبی تخلیقات پر بنائی گئی فلموں پر نظر ڈالی جائے تو

اس سلسلے میں سب سے پہلا نام آغا حشر کاشمیری کا سامنے آتا ہے۔انہوں نے ''سورداس'' (1914)،'' ترکی چور'' (1922)، 1931ء میں'' شرون کمار''، ''یہودی کی لڑکی'' اور''چنڈی داس''۔''عورت کا پیار'' (1933)،''خوابِ ہستی'' (1934)، 1936ء میں''صیدِ ہوس''،''رستم سہراب'' اور اسیرِ حرص جیسی فلموں کے علاوہ رومانیت پرلازوال تاریخی ڈراما''شیریں فرہاد'' اہم کارنامہ تھا۔جس پراسی نام سے 1931، 1945 اور 1954 میں تین بار فلمیں بنائی گئیں۔ان کے علاوہ سید آغا حسن امانت کا''اندر سبھا'' سید امتیاز علی تاج کا''انارکلی'' اس عہد کے مقبول شاہکار ہیں۔منشی پریم چند معاصر افسانے کے مقبول ترین مصنف ہیں۔ان کی کہانیوں پر بھی فلمیں بنائی گئیں جن میں 1934 میں''سیوا سدن'' (اردو نام: بازارِ حسن) اور''دی مِل''۔'' رنگ بھومی'' (1946)،''پنچایت''(1958)،''ہیرا موتی'' (1959)،''گودان'' (1963)،'' غبن''(1966)،'' شطرنج کے کھلاڑی''(1977) اور'' ٹی۔وی سدگتی'' (1981) جیسی فلمیں مشہور ہیں۔کرشن چندر کے ڈرامے''سرائے کے باہر'' کو 1947 میں فلما کر ریلیز کیا گیا تھا۔رئیس احمد جعفری کے اردو ناول''درد'' پر اے۔آر۔کاردار نے 1947ء میں اسی نام سے بیحد خوبصورت فلم بنائی تھی۔مرزا ہادی رسوا کے ناول''امراؤ جان ادا'' پر سب سے پہلے 1958ء میں فلم''مہندی'' پھر اصل عنوان سے''امراؤ جان'' پر دو فلمیں (1981ء میں ریکھا اور 2006ء میں ایشوریا رائے) سلور اسکرین پر جلوہ گر ہوئیں۔رضیہ بٹ کے ناول''ناہید'' پر 1971ء میں فلم''محبوب کی مہندی'' بنی تھی۔علیم مسرور کے ناول''بہت دیر کردی'' پر مبنی 1985ء میں فلم''طوائف'' (اردو سرٹیفکیٹ کے ساتھ) پیش ہوئی تھی۔عصمت چغتائی نے اپنے فلم ساز شوہر شاہد لطیف

کے لیے کئی فلمیں لکھیں۔ان کی کہانیوں اور افسانوں پر بھی فلمیں بنائی گئی ہیں۔فلم ''ضدی''(1948)،فلم'' آرزو''(1950)،فلم''خواب آئے گا''(1953)، فلم''دروازہ''(1954)،فلم''سوسائٹی''(1955)،فلم''سونے کی چڑیا'' (1955)،فلم''گرم ہوا''(1973)،فلم''برکھا بہار''(1973)،فلم''محفل'' (1978)کے جیسی بے مثال فلمیں لکھیں۔

معاصر تنقید نگاروں میں پروفیسر جاوید قدوس نے بدلتے دور کی روایات اور فنی و تکنیکی پہلوؤں پر بڑی خوبصورت بات کہی ہے کہ

> ''کسی بھی زندہ اور متحرک زبان میں،جیسی کہ اردو ہے،شعر و ادب کے حوالے سے لسانی،موضوعاتی،اظہاری اور بیانیاتی اعتبار سے تغیر و تبدل کا رونما ہوتے رہنا ایک فطری عمل ہے۔لیکن کوئی بھی تبدیلی دِن اور تاریخ کے تعیُن کے ساتھ وجود میں نہیں آتی۔شعر و ادب میں رجحان اور رویہ سے لے کر'ہئیت'(FORM) روایات اور رسومیات وغیرہ بدلتے بدلتے بدلتی ہیں اور جو چیزیں بدل نہیں پاتیں،وہی شعر و ادب کی مستقل قدریں قرار پاتی ہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ زمانی اعتبار سے آج جو رجحان یا رویہ ادب میں نمایاں ہو رہا ہے،عین ممکن ہے کہ اس کی جڑیں کسی سابقہ شعری یا افسانوی تخلیق(تخلیقات)میں موجود ہوں؟''

آج کی فلمیں عقل سے ماورا،غیر موجود اور غیر حقیقی تخیل اور طلسماتی دنیا میں اپنے اپنے وجود کو منوانے میں ایک دوسرے کی دوڑ میں نظر آتی ہیں اور ناظرین کو کیا کچھ سہنا پڑتا ہے اس کی مثال سائی فائی فلموں کے ساتھ کرشن چندر کے افسانوی

مجموعہ ''ہم وحشی ہیں'' نومبر ۱۹۴۷ء میں شائع ہوئے علی سردار جعفری کے دیباچہ سے دی جاسکتی ہے۔ سردار جعفری کے الفاظ آج بھی عوام وخواص کو دعوتِ فکر دیتے ہیں۔

> ''کہتے ہیں پرانے زمانے میں دیوتاؤں اور راکھششوں میں لڑائی ہوئی تو انہوں نے سمندر کو مَتھ ڈالا۔ اس میں سے پہلے 'امرت' نکلا اور پھر 'زہر'۔ اور شِیو نے دنیا کو بچانے کے لئے وہ زہر پی لیا۔ آج ہندوستان سچ مُچ ایک متھے ہوئے سمندر کی طرح ہے۔ جس میں سے آزادی کا امرت بھی نکلا ہے اور نفرت کا زہر بھی۔ اس کو پینے کے لئے ایک شیو کافی نہیں، کروڑوں کی ضرورت ہے۔ فقط چند انسان اس زہر کو حلق کے نیچے نہیں اتار سکتے، بلکہ ہم سب کو مِل کر، ایک ایک بچے، ایک ایک عورت، ایک ایک مرد کو یہ زہر پینا پڑے گا''۔ (دیباچہ، ہم وحشی ہیں، سردار جعفری ۱۹۴۷ء)

ادب کی ہر صنف میں اصلاً زندگی، زمانہ اور ذات کے سرد و گرم تجربات و مشاہدات کا ہی اظہار و بیان ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ زندگی کی طرح ادب کے افہام و تفہیم میں بھی نظم و ضبط قائم رکھنے کے لئے چند اصولوں اور قاعدوں کی پاسداری ضروری ہے۔ لہذا جس طرح شاعری میں شعریت اور نثر میں 'نثری پن' کے علاوہ غزل میں 'غزلیت' اور افسانہ میں 'افسانویت' کا کسی نہ کسی حد تک ہونا ضروری تصور کیا جاتا ہے اور آج کی تاریخ میں ہر ادبی اظہار، کسی نہ کسی صنف، 'ہیئت'' میں فنی اور جمالیاتی در و بست کے ساتھ ہوتا ہے۔ اصناف کئی ہیں۔ لیکن کسی بھی صنف ادب کو اس کے 'کُل' (Totality) میں سمجھنے کے لئے، جس زبان اور ماحول و معاشرہ میں وہ ادب لکھا جا رہا ہے اس زبان کی روایات، رسومیات، فکریات، بیانیات بالخصوص

عہد بہ عہد بدلتی ہوئی ''ہئیت'' (Forms) کی لہروں کی آگہی بھی ضروری ہے۔اسی طرح آج کی فلم کو دیکھنے اور سمجھنے کے لیے عہد جدید کی عینک کا ہونا لازمی ہے۔

یوں تو دنیا میں تفریح طبع کے لئے بہت ساری فلم انڈسٹریز قائم کی گئی ہیں مثلاً:

۱۔ بالی ووڈ ممبئی پر مبنی ہندی زبان کی فلم انڈسٹری، انڈیا میں

۲۔ پولی ووڈ پنجابی زبان کی فلم انڈسٹری انڈیا اور پاکستان میں

۳۔ لولی ووڈ۔لاہور میں پاکستانی فلم انڈسٹری کی اردو اور پنجابی فلمیں۔

۴۔ چھولی ووڈ، چھتیس گڑھ، انڈیا

۵۔ ٹولی ووڈ، بنگالی فلم انڈسٹری میں مغربی بنگالی فلم انڈسٹری، آندھرا پردیش اور تلنگانہ میں۔

۶۔ کولی ووڈ، تامل زبان کی فلم انڈسٹری، جو چنئی، انڈیا میں واقع ہے۔/ نیپال کی فلم انڈسٹری

۷۔ مولی ووڈ، ملیالم فلم انڈسٹری کیرالہ میں، انڈیا

۸۔ سینڈل ووڈ، کنڑ زبان کی فلم انڈسٹری کرناٹک، انڈیا میں۔

۹۔ جولی ووڈ، آسامی زبان کی فلم انڈسٹری گوہاٹی، آسام میں

۱۰۔ اولی ووڈ، فلم انڈسٹری، اوریسا کی فلم انڈسٹری۔

۱۱۔ سولی ووڈ، سندی

۱۲۔ ڈھالی ووڈ، بنگلہ دیش

۱۳۔ کاری ووڈ، کراچی

۱۴۔ کالی ووڈ، نیپالی

۱۵۔ ڈھولی ووڈ، گجراتی

۱۶۔ گھولی ووڈ، گانا (سوتھ افریکہ)

۱۷۔ ہیلی ووڈ، ونڈا

۱۸۔ کینی ووڈ، نیجیر یا

۱۹۔ نولی ووڈ، نیجیر یا

۲۰۔ ریورووڈ، کینیا

۲۲۔ اسوا ہیلی ووڈ، تنزانیہ

۲۳ ۔اگا ووڈ، اُوگنڈا،

۲۴۔ زولیوووڈ، زمبابے

۲۵۔ مولی ووڈ، یوایس مرمون،

۲۶۔ ہالیووڈ، سوتھ کوریا وغیرہ وغیرہ

لیکن ہم عام طور پر دو کی ہی بات کرتے ہیں ہالی ووڈ اور بالی ووڈ۔ کیوں؟

کیوں کہ بالی ووڈ، ہماری انڈسٹری ہے اور دنیا کی سب سے زیادہ فلمیں یہیں بنائی جاتی ہیں۔ جبکہ ہالی ووڈ تو ٹیکنالوجی اور پیش کش میں سب سے معیاری اور منفرد انڈسٹری ہے۔ اب آپ سوچیں گے کہ جب ہم اردو کی بات کرتے ہیں تو پاکستانی سنیما یعنی لولی ووڈ اور کاری ووڈ کی بات کیوں نہیں کرتے۔ کیوں کہ ان کا اثر، ان کا پھیلاؤ اور ان کا چرچا اتنا نہیں ہے جتنا معیار اور چرچا ہماری فلموں کا ہے بلکہ آپ جانتے ہیں کہ پاکستان کا بچہ ہو یا بوڑھا ہماری ہندوستانی فلموں کا شیدائی ہے۔ ادب کے ساتھ فلمی دنیا میں بھی اردو کا بول بالا رہا ہے۔ بیشتر کہانی کار، اسکرپٹ رائٹر اور اسکرین پلے رائٹر اردو کے ہی جانکار رہے ہیں۔ جن میں کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، راجندر سنگھ بیدی، مہندر ناتھ، اختر الا ایمان، ڈاکٹر راہی معصوم رضا، قادر

خان، سلیم جاوید، کمال امروہی، آصف علی، مظفر علی، گلزار، جاوید اختر وغیرہ ایسے مکالمہ نگار اور ہدایت کار رہے ہیں جن پر فلمی دنیا کو بھی ناز ہے۔

ہندوستانی فلموں میں جن شعرا کرام کے نغموں کی گونج رہی، ان میں جاں نثار اختر کا نام نامی بڑا مقبول ہے۔ جاں نثار اختر اگر چہ ترقی پسند شاعر تھے، تاہم انھوں نے مختلف موضوعات کو اپنی شاعری میں برتا ہے۔ جن میں رومان بھی ہے، انقلاب بھی، امید بھی ہے، درد بھی ہے ہجر و وصال بھی ہے اور مسائل روز گار بھی۔ بے شک ابتدا میں ان کو فلمی دنیا میں مقبولیت نصیب نہ ہوئی لیکن او پی نیر کی موسیقی سے سجی گرودت کی فلم سی آئی ڈی میں 'اے دل ہے مشکل جینا یہاں ذرا ہٹ کے ذرا بچ کے یہ ہے ممبئی میری جاں' کی کامیابی کے بعد انہوں نے کبھی مُڑ کر نہیں دیکھا۔ سال 1976 میں جاں نثار اختر کے قیمتی فلمی شراکت کو دیکھتے ہوئے انہیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ تقریباً چار دہائیوں کے اپنے فلمی کیریئر میں انہوں نے 80 فلموں کے لئے نغمے لکھے۔ بعدازاں فلم انڈسٹری میں اس روایت کو ان کے بیٹے ''جاوید اختر'' نے بھی قائم رکھا۔ جاوید اختر نے بھی اس فن میں مہارت حاصل کی اور تیرے لیے ہم ہیں جیے ہونٹوں کو سِے، تیرے لیے ہم ہیں جیے ہر آنسو پیے (ویر زارہ۔ شارخ، پریتی، رانی مکھر جی)۔ ہر گھڑی بدل رہی ہے روپ زندگی، چھاوں ہے کبھی کبھی ہے دھوپ زندگی (کل ہو نہ ہو۔ شارخ، سیف، پریتی)۔ یوں ہی چلا چل راہی یوں ہی چلا چل راہی کتنی حسین ہے یہ دنیا (سودیش۔ شارخ، گایتری جوشی)۔ وغیرہ جیسے مشہور نغمے جاوید اختر نے ہندوستانی سنیما کو دیے ہیں۔

اردو شاعری کو ایک نئی جہت دینے والے ہندستان کے مشہور نغمہ نگار اور ہدایت کار گلزار (سمپورن سنگھ کالرا) نے بطور شاعر بے شمار فلموں میں نغمے لکھے، ان کی

فلمی شاعری میں ایک اچھوتا پن پایا جاتا ہے۔شاعری میں تشبیہات کا استعمال ان کے نغموں کو منفرد بناتا ہے۔انہوں نے اپنے فلمی کیریئر کا آغاز 1961 میں ول رائے کے اسسٹنٹ کے طور پر کیا۔راہل دیو برمن کی موسیقی میں بطور نغمہ نگار گلزار کی صلاحیت نکھر کر سامنے آئی اور انہوں نے ناظرین اور سامعین کو'' مسافر ہوں یارو (پریچے)، تیرے بنا زندگی سے کوئی شکوہ تو نہیں (آندھی)،تم آ گئے ہو نور آ گیا ہے نہیں تو چراغوں سے لو جا رہی تھی (آندھی۔سنجیو کمار،اوم شیو کماری) گھر جائے گی (خوشبو)، میرا کچھ سامان (اجازت)،تجھ سے ناراض نہیں زندگی (معصوم)، یاراسِلی سِلی بِر ہا کی آگ میں جلنا (لیکن۔ونو دکھنا،ڈمپل کپاڑیا،)۔گلزار کے ان نغموں کے علاوہ اور بھی مشہور نغمے ہیں جو اردو زبان کی دین ہیں۔اپنے نغموں کے لئے وہ اب تک 11 مرتبہ فلم فیئر ایوارڈ اور تین مرتبہ قومی ایوارڈ ، 2004 میں پدم بھوشن سے سرفراز کیا گیا۔جبکہ اردو زبان میں ان کی مختصر کہانیوں کے مجموعہ ''دھواں'' کو 2002 میں ساہیتہ اکیڈمی ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔گلزار فلم انڈسٹری کے اعلیٰ ترین اعزاز دادا صاحب پھالکے ایوارڈ سے بھی نوازے جا چکے ہیں۔2009 میں فلم ''سلم ڈاگ ملینیئر''میں ان کا نغمہ ''جے ہو'' کو بہترین اوریجنل گانا کے ایوارڈ سے نوازا گیا۔ نغمہ نگاری میں گلزار اور جاوید اختر کے بعد آنے والی نسل میں شکیل اعظمی،سعید قادری جلیش شیروانی، پرسون جوشی،منوج منتشر،ارشاد کامل وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ پرسون جوشی کے قلم سے نکلے مشہور فلم ''فنا'' کے نغمے کے بول ملاحظہ ہوں۔

چاند سفارش جو کرتا ہماری، دیتا وہ تم کو بتا
شرم و حیا کے پردے گرا کے کرنی ہے ہم کو خطا
ضد ہے اب تو ہے خود کو مٹانا، ہونا ہے تجھ میں فنا

شکیل اعظمی کے گیت 'زہر' تھپڑ، آرٹیکل 15، ملک، شادی میں ضرور آنا، ضد، مدہوشی، تم بن ۲، ہائٹڈ، نظر، عشق کے پرندے، دھوم دھڑکا، کر لے پیار کر لے، وہ تیرا نام تھا، ٹرپ کارڈ، چہرے، تہذیب، گوسٹ، میرا فوجی کالنگ جیسی دیگر فلموں کے علاوہ بہت سی ویب سیریز میں بھی سنے جا سکتے ہیں۔فلم زہر میں شامل ان کے گیت کے بول سنیں

جانِ جاں جانِ جاں تجھ سے بچھڑ کے میں جاوں کہاں
ہو کے جدا ہے ساتھ بھی
تو دور بھی تو پاس بھی
جیسے زمیں سے ہے یہ آسماں

ہندوستانی نغمہ نگاروں میں ارشاد کامل نے بھی بہت سی فلموں کے لیے سپر ہٹ گیت لکھے ہیں جن میں ''جب وی مٹ''چمیلی، لوآج کل، راک سٹار، عاشقی ۲، رانجھانا، ہائی وے، تماشا جیسی فلموں میں بڑے خوبصورت گیت دیے ہیں۔جن میں ''ہاں ہے کوئی تو وجہ جو جینے کا مزہ یوں آنے لگا، یہ ہواوں میں ہے کیا تھوڑا سا جو نشہ یوں چھانے لگا (جب وی میٹ۔شاہد، کرینا)۔آج ان سے ملنا ہے ہمیں، چل ان کے لیے کچھ لیتے چلے اور ان کو دعائیں دیتے چلے (پریم رتن دھن پایو۔سلمان، سونم)۔تو من شدی تو من شدی، من تو شدم تو من شدی (رانجھا۔ابھے، شونم، دھنش) آہستہ آہستہ کا یہ نغمہ بہت مقبول ہوا ہے۔

عشق نے تیرے عشق میں کر دیا بے خبر
بے چین شام و سحر بس تجھے یاد کرتا ہوں میں رات بھر

ہندوستانی فلم میں منوج منتشر کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔انہوں نے

جو نغمے ہندوستانی سنیما کو دیے ان میں ''ہم جو ہر موسم پے مرنے لگے وجہ تم ہو، ہم جو شعر وشاعری کرنے لگے وجہ تم ہو (وجہ تم ہو۔ زرین، شرمن جوشی)۔ قدم سے قدم جو ملے تو پھر ساتھ ہم تم چلے، چلے ساتھ ہم تم جہاں وہیں پے بنے قافلے (قابل۔ رتک، یمی گوتم)۔ تو آتا ہے سینے میں جب جب سانسیں بھرتا ہوں، تیرے دل کی گلیوں سے میں ہر روز گزرتا ہوں (دھونی۔ سشانت، دشا پٹانی)۔ یہ ایسے نغمہ نگار ہیں جن کے نغموں میں اردو زبان کا استعمال حد درجہ پایا جاتا ہے۔ ان مذکورہ اشخاص علاوہ شبیر احمد اور بشر نواز جیسے نغمہ نگار بھی ہیں جو اپنے نغموں، مکالموں اور فلمی کہانیوں میں معیاری اردو کا استعمال کرتے ہیں۔

80/90 کے دورانیہ میں فلموں میں بے ڈھنگ اور بیہودہ گیتوں نے سنجیدہ لوگوں کو بیزار کر دیا، ایسے میں ندیم شراون اور سمیر نے موسیقی اور شاعری کو ناگوار بننے سے بچانے کی کوششیں جاری رکھی۔ جس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

نظر کے سامنے جگر کے پاس، کوئی رہتا ہے، وہ ہو تم

اسی طرح فلم ''دل ہے کہ مانتا نہیں'' کا ٹائٹل سانگ

دل ہے کہ مانتا نہیں

یہ بیقراری کیوں ہو رہی ہے

یہ جانتا ہی نہیں

فلموں میں اردو زبان کا استعمال ان کے ناموں سے لے کر نغمات، مکالمے، منظر اور پس منظر تک بہ آسانی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ہندی زبان کی سند رکھنے والی فلمیں بھی اردو الفاظ، تلفظ، اور نغمات کی وجہ سے ہی مقبولیت پاتی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فلموں کی بدولت اردو نے کافی حد تک فروغ پایا۔ بالخصوص

تقسیم ہند کے بعد اردو پر چھائی ہوئی یاسیت کو مسرت وشادمانی میں تبدیل کرنے کے لیے فلموں نے اہم رول ادا کیا۔

1947 میں نور جہاں اور دلیپ کمار کی فلم ''جگنو'' ریلیز ہوئی ۔ یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ 1947ء میں آزادی اور تقسیم ملک کے بعد اتر پردیش کی نور جہاں پاکستان چلی گئی اور ملکہ ترنم کہلائی اور پشاور کے یوسف خان ہندوستان میں رہ گئے اور دلیپ کمار کی حیثیت سے سپر سٹار کے منصب پر فائز ہوئے اور ٹریجڈی کنگ کہلائے۔

آزادی کے بعد ہندوستان میں دیش بھگتی پر مبنی فلمیں بنانے کا رجحان عام ہوا اور'' شہید'' 1948ء'' نیا دور'' 1957 کے علاوہ ''اور انسان جاگ اٹھا'' 1958 جیسی فلمیں منظر عام پر آئیں ۔ان فلموں کے مکالمے اور گیتوں نے اردو زبان کے استعاروں، محاوروں اور ضرب الامثال کے ذریعے پورے ملک میں مذہبی اتحاد کو مضبوط اور مستحکم بنانے میں تاریخی کردار ادا کیا۔آج کی تاریخ میں ایک بار پھر ایسے ہی مذہبی اتحاد کی اشد ضرورت ہے۔اور ہندوستانی فلمیں اس ضرورت کی تکمیل اردو کے مکالموں اور گیتوں کے وسیلے سے بہتر طور پر کرسکتی ہے۔

جس طرح اردو ہماری گنگا جمنی تہذیب کی علامت ہے اسی طرح فلم بھی ہمارے ہندوستان کی مشترکہ تہذیب وتمدن اور کلچر، قومی یکجہتی، حب الوطنی اور قومیت کی علمبردار ہے۔دنیا کے کونے کونے میں فلموں کے دم سے اردو کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔اس کی ضمانت 1955ء میں بنی فلم ''شری چار سو بیس'' کا یہ مقبول گیت ہماری قومیت کی بہترین مثال ہے۔

میرا جوتا ہے جاپانی

یہ پتلون انگلستانی
سر پہ لال ٹوپی روسی
پھر بھی دل ہے ہندوستانی

جیسے جیسے ادب میں وقت وحالات کے پیش نظر مختلف اصناف کی تکنیک اور فن میں تبدیلیاں رونما ہوتی رہی ہیں۔ٹھیک ویسے ہی فلم بھی کسی ایک فارمولے کی محتاج نہیں رہی۔اب پردۂ سیمیں پر ہیرو ہیروئن کا درختوں اور ندی نالوں یا چشموں کے ارد گرد گھومتے اور رومانس کرنے کے بجائے نئی افسانوی دنیا تخلیق کی جارہی ہے۔یہاں حقیقی کرداروں کے بجائے ،مافوق الفطرت عناصر یا پھر یوں کہیے کہ سائنسی ایجادات وعجائبات کی دنیا دیکھنے میں شائقین محظوظ ہورہے ہیں۔اس کے برعکس حقیقی فلمیں بھی دکھائی جارہی ہیں۔کیا حقیقت دیکھنا مشکل کام ہے یا عجائبات کو دیکھنا آسان ہوگیا ہے۔ڈاکٹر ، پولیس ، وکیل ، جج ، لیڈر ، بچہ ، بوڑھا ، وائرس سپریڈرس،کڈنیپرس kidnapers،کڈنی سمگلرز،دودھ اور شراب میں پانی اور زہر ملانے والے، ماب لینچرز ، لینڈ مافیہ،نقلی ادویات فروخت کرنے والے ، اسکول یا نرسنگ ہومز کی آڑ میں عصمت خور، اصلاحی ،فلاحی اور مذہبی پیش واؤوں کے اڈے، سونا، چاندی، ہیرے جواہرات سے لے کر مٹی ،اینٹ، پتھر، ریت، بجری، کوئلہ، پیاز اور گاس پھوس کا گوٹلہ کرنے والے،جسم فروشی کا دھندا چلانے والے یا انتخابی چناؤ یا پولیس کے فیک انکاؤنٹرز ، گینگ ریپرز۔۔۔ ہر کردار فلموں میں جیتا جاگتا اور بولتا نظر آتا ہے۔اسی لئے قارئین کی طرح ناظرین اور شائقین بھی ایک ہی طرح کا ادب ہو یا فلم دیکھنے، سننے اور پڑھنے کے عادی نہیں رہے، ہر دم انہیں کچھ نیا چاہیے۔بقول ندا فاضلی

دھوپ میں نکلو گھٹاؤں میں نہا کر دیکھو
زندگی کیا ہے ؟ کتابوں کو ہٹا کر دیکھو

آج سنیما (فلم)ایک طاقت ور وسیلہ اظہار ثابت ہو رہا ہے۔فلموں کو مقبول عام بنانے میں اردو کا کلیدی رول رہا ہے اور اردو کو عام فہم بنانے میں فلموں کا کردار بھی نا قابلِ فراموش ہے۔

آج ہندوستانی فلم اس قدر اہمیت اور افادیت حاصل کر چکی ہے کہ اسے اسکولوں، کالجوں اور یونی ورسٹیوں کے نصاب کا حصہ بنایا جا رہا ہے۔ مختلف مدتی کورس کروائے جا رہے ہیں، تھیٹر کروائے جا رہے ہیں، میڈیا سنٹر قائم کیے جا رہے ہیں، اکادمیاں اور انسٹی چوٹ بنائے جا رہے ہیں، ملک کے مختلف شہروں میں ناٹک میڈلیوں کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں سیمینار منعقد ہو رہے ہیں۔کتاب میلوں کی طرح فلمی میلے بھی منعقد کیے جا رہے ہیں۔ ہمارے فلم ساز ایسی فلمیں بنا رہے ہیں جو بین الاقوامی سطح پر دیکھی جا رہی ہیں۔سب جانتے ہیں کہ فلمیں خود اعتمادی پیدا کرتی ہیں، اس لیے طلبا فلموں میں اداکاری، ہدایت کاری، مکالمہ نگاری، نغمہ نگاری کے علاوہ دیگر شعبوں میں روزگار حاصل کرنے کے لیے کام کرتے ہیں۔طلبا کی پرسنلٹی ڈیولپمنٹ (شخصیت سازی) کے لیے اداروں میں اداکاروں، ہدایت کاروں کے انٹرایکٹیو سیشن Interactive Session رکھے جاتے ہیں۔لیکن افسوس کہ اتنا کچھ ہونے کے باوجود ہمارے سماج میں فلمیں دیکھنا آج بھی معیوب سمجھا جاتا ہے۔

فلم، ادب کی طرح زندگی کا ایک اہم حصہ ہے۔اس نقطہ نظر سے ایسی ایسی فلمیں بنائی جا رہی ہیں جو قوم و ملک، مذہب و ملت اور ہر رنگ و نسل کے لیے یقینی

طور پر سود مند ثابت ہوں گی۔ ہندوستانی فلم آج کی فکر اور آج کے تخلیقی سرچشموں کا مرکز ہے فینٹا سی، گلیمرس اور سائی فائی کی بدولت ایسا لگتا ہے کہ فلم زندگی سے بڑی Larger Than Life بن گئی ہے۔ بقول علامہ اقبال

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

ادب اگر تاریخ کا آئینہ ہے تو فلم اس کا عکس۔ فلم اور اردو کا تعلق محض چولی دامن کا نہیں ہے بلکہ جسم اور روح کا ہے۔ ایک نے دوسرے کو پہچان دی ہے۔ ایسے میں کچھ عناصر نے فلموں سے اردو کو ہٹا کر ایک خلا پیدا کیا اور اس خلا کو گندگی نے پُر کیا ہے۔ گویا جہاں سے اردو ہٹی وہاں گندگی نظر آئی۔ بہر حال جہاں تک ممکن ہو سکے خود کو اردو کے قالب میں ڈھالیں کیونکہ اردو ہندوستان کی زبان ہے۔ ہماری تہذیب و تمدن کی پہچان ہے اسے بچانا بھی ہمارا فرض ہے ورنہ وہ دن دُور نہیں جب ہر طرف ایسی آوازیں ہی سننے کو ملیں گی۔

ہیر تو بڑی sad ہے آج کل very mad ہے۔ (تماشا)

کاجل کی سیاہی سے لکھی ہے جانے تو نے کتنوں کی love storiyan (کیسریا)

تیرے لیے ہی تو signal توڑتا تاڑ کے، آیا دہلی والی girlfriend چھوڑ چھاڑ کے

(یہ جوانی ہے دیوانی)

ابھی تو Party شروع ہوئی ہے۔ (خوبصورت)

بعد میں نہ کہنا کچھ بھی، پہلے ہی دے دو Warning

Party چلے گی Till six in the morning

بہر کیف ان سب کے بیچ یہ گیت بھی آج کے ہی ہیں:

تجھے یاد کرلیا ہے آیت کی طرح (فلم: باجی راؤ مستانی)

خاموشیاں آواز ہیں تم سننے تو آؤ کبھی (فلم: خاموشیاں)

المختصر ہندوستانی فلموں کا اردو ادب سے جو مضبوط، مستحکم اور پائیدار رشتہ ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔فلموں کے فروغ اور انہیں مقبول عام بنانے میں اردو زبا ن کا بے حد اہم رول ہے اور فلموں نے اردو زبان کو اس قدر سہل اور آسان کر دیا ہے کہ اس کے عاشق کشمیر سے کنیا کماری اور راجستھان سے اروناچل پردیش ہی نہیں بلکہ خلیج ممالک کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی سطح پر بھی موجود ہیں۔

☆☆☆